غزلیات

قلم قلم روشنی

غنی غیور

غزلیات

قلم قلم روشنی

(نظرثانی شدہ ایڈیشن)

غنی غیور

© غنی غیورؔ

QALAM QALAM ROSHNI

by

Ghani Ghayoor (Abdul Ghani Jagil)

Ist. Edition - 2022
IInd Edition - 2023
ISBN: 978-93-92611-87-2
₹ 300/-

نام کتاب	:	قلم قلم روشنی
شاعر	:	غنی غیور
اصل نام	:	عبدالغنی جاگل
اشاعت اول	:	۲۰۲۲ء
اشاعت دوم	:	۲۰۲۳ء
تعداد	:	۵۰۰
کمپوزنگ	:	فوزیہ کمپیوٹر جموں
ملنے کا پتہ	:	قاسمی کتب خانہ تالاب کھٹیکاں جموں

چاندنی جب تک رہی بیٹھا رہا، دلبر کے ساتھ
چاند ڈوبا تو یہ دل ڈوبا مِرا، دلبر کے ساتھ

تم سمجھتے ہو جُدا تم کو مبارک ہو یہ دین
جب بھی دیکھا میں نے دیکھا ہے خدا، دلبر کے ساتھ

ہیچ خود کو جانتا ہوں حیثیت میری ہے کیا
دیکھئے صاحب! مِرا قد ہے بڑا دلبر کے ساتھ

دل میں شب کو جو ہوا تھا جاگزیں اس کا خیال
ساتھ میرے وہ رہا اور میں رہا دلبر کے ساتھ

قائم اس کی ذات ہے قیّوم دل میرا غنی
شاخِ سدرہ اور مقامِ منتہا دلبر کے ساتھ

رعب لوگوں پر جماتے بھی تو کیا
عاجزی میں پھر دکھاتے بھی تو کیا

جیتنا تھا کون سا میدان پھر
کاٹھ کے گھوڑے چلاتے بھی تو کیا؟

ہاتھ میں تسبیحِ صد دانہ لئے
محفلوں میں آتے جاتے بھی تو کیا

بھیڑ میں گُم ہونے کا اندیشہ تھا
ہاتھ لوگوں سے ملاتے بھی توکیا

قُدسیوں سے داد و تحسین غزل
عرش پر جا کر جو لاتے بھی تو کیا

بہت سی نیم جانیں کھائے گی پیاس
تبھی آتش فشاں بن جائے گی پیاس

سمندر کو گلا دریاؤں سے ہے
بجھی ہے اور نہ ہی بجھ پائے گی پیاس

ابھی تو بوجھ ہے دل پر غموں کا
پڑی شبنم تو پھر بڑھ جائے گی پیاس

ہوس سے جو بچی رہ میں تو اک روز
مرادوں کے ثمر بھی پائے گی پیاس

تمازت اپنے سورج کی بڑھا دو
سمندر آنکھ میں بھر لائے گی پیاس

بہار آئی ہے پُھلکاریوں کا موسم ہے
دکھاؤ چہرہ کہ دلداریوں کا موسم ہے

ہری بھری ہے ہراک شاخ پنچھیوں کے جھنڈ
چمن کی سیر ہے گُل باریوں کا موسم ہے

پھلانگتے ہیں پرندے بھی سرحدوں کو ابھی
کُھلے ہیں ویزے کہ رہ داریوں کا موسم ہیں

نہ انتظارِ شراب طہور کھینچیں گے
کہ آبِ سادہ ہی دو،یاریوں کا موسم ہے

کئی دنوں سے غنی قید ہیں گھروں میں ہم
ہمارے شہر میں بیماریوں کا موسم ہے

جان جسموں کی ہے رگوں میں خُدا
کہتے ہیں رہتا ہے دلوں میں خُدا

بھوک اور پیاس میں اسے ڈھونڈو
تھکے ہارے مسافروں میں خُدا

پھول راہوں میں بیچتا ہے وہی
جا نہیں سکتا مندروں میں خُدا

ظاہری آنکھ سے نہیں دِکھتا
جاگتا جیتا ضابطوں میں خُدا

سیڑیوں پر تھا صحنِ مسجد میں
دَبی آواز ، سسکیوں میں خُدا

اور ہی دنیا کے یہ ناگے☆ ہوئے
گیت میرے ہیں الگ راگے ہوئے

اون مشکل کاتنا تھی عشق کی
مشکلوں سے معتبر دھاگے ہوئے

نیند آتی ہی نہیں تیرے بغیر
ایک مُدّت ہوگئی جاگے ہوئے

فتح کی سیٹی بجا کر دیکھئے
لوٹ آئیں گے جواں بھاگے ہوئے

صبح تک وہ جاگتے تھے رات بھر
اس لئے ہم سے بہت سے آگے تھے

☆ ناگے یعنی ناگے بابے

جلتا رہا بُجھتا رہا میرا دیا کرتا بھی کیا
ظلمات میں چلتا تن تنہا رہا کرتا بھی کیا

اِس ہاتھ میں جلتی ہوئی تھی ایک لکڑی اور میں
گرتا رہا اُٹھتا رہا آگے بڑھا کرتا بھی کیا

کچھ یوں دکھائی دی مجھے وہ سانپ کی کاٹی بَہَن
حد سے زیادہ درد میں تھی مُبتلا کرتا بھی کیا

بر دخترِ ایراں، سلامے از من ہندی نژاد
سنگِ ملامت بود در دستِ ریا، کرتا بھی کیا

کیوں پھاڑ ڈالی ایک پاگل نے ردا اس کی غنی
پتھر کے ٹکڑے ڈھونڈتا میں رہ گیا کرتا بھی کیا

نلوں میں پانی نہ تھا انتظار کرنا تھا
تمہیں تو اپنے گھڑوں سے ہی پیار کرنا تھا

گُہر نہیں تھے تو کیا؟ موج موج مستی میں
وفور و جذبِ دروں ہی شمار کرنا تھا

لٹانا سیپ کے مانند تھا بدن اپنا
ورائے سود و زیاں کاروبار کرنا تھا

تری پسند کے معیار ہی بدل جاتے
مِرے دیار کو اپنا دیار کرنا تھا

اگر چہ عشق میں گھاٹا بہت ہوا ہم کو
یہ پُل صراط بہر حال پار کرنا تھا

ہر ایک زاویے سے دیکھ اچھا چلتا ہے
تِرے فقیر کا دنیا میں سکّہ چلتا ہے

ہمیں کمانے کی بھی کچھ زیادہ فکر نہیں
دِہاڑی لگتی ہے بس خرچہ ورچہ چلتا ہے

ہمارے ملک میں وقعت نہیں قطاروں کی
روایت اپنی ہے یہ دھکّا مُکّا چلتا ہے

ہزار نام ہیں رشوت کے لینے دینے میں
نیاز و نذر کہیں کوئی تحفہ چلتا ہے

ہماری مٹّی سے اُگتی ہے فصلِ وہم فقط
غیور ٹوٹکا چلتا ہے ٹونا چلتا ہے

میری آنکھوں نے نئی پرواز بھرنے کے لئے
پر نکالے آسمانی سیر کرنے کے لئے

گوہرِ مقصود ہے گہرے سمندر میں نہاں
سعی کر، گرداب سے تُو بھی ابھرنے کے لئے

اک پرندے کی طرح تنہا سفر کرنا ہے اور
تاک میں بیٹھا شکاری پر کترنے کے لئے

زندگی تیری حوادث کا ہے کوئی سلسلہ
تونے سمجھا ہے اسے لیکن سنورنے کے لئے

آدمی کو جُہدِ پیہم کے لئے پیدا کیا
روٹیاں کھا کر نہیں کم بخت مرنے کے لئے

لفظ جامد مخمصے میں رہ گیا
سیلِ معنیٰ ایک دریا بہہ گیا

راہ نابینا نہ تھا پر عشق میں
دھول سے لپٹا سفر میں رہ گیا

رہ گئی ثابت جگہ پر جھونپڑی
گھر جو پکّا زلزلے میں ڈھ گیا

چپ رہا عاقل کہ دنیا دار تھا
اک دِوانہ بات سچّی کہہ گیا

پیڑ پیکر تھا سخاوت کا غنی
زخم کھا کے درد اکثر سِہہ گیا

آگے خود ہی تم سمجھ لو، استعارہ لکھ دیا
میل کے پتھر پہ جلدی میں اشارہ لکھ دیا

ہم نے چھانی خاکِ صحرا پی لئے دریا تمام
صحرا صحرا دریا دریا ایک پیاسا لکھ دیا

مہر و شفقت داستاں ہے یا حقیقت کیا پتہ؟
کیا بزرگوں نے محبت سے دلاسا لکھ دیا

حاصل صد شوق سونے پر سُہاگا یہ غزل
ہم نے گردابِ بلا کو بھی کِنارا لکھ دیا

سب کتابوں کو اور مٹا کر سب حروف
دل صحیفے پر غنی سچ نام تیرا لکھ دیا

خمیازہ دکھاوے کا اٹھانا ہی پڑا تھا
سو جسم کو مٹی میں ملانا ہی پڑا تھا

رِس رِس کے ہوئے گھاؤ تھے گُل بوٹے انوکھے
سینے میں لگا باغ دکھانا ہی پڑا تھا

پروا نہ کی پردیس میں جا بھول گیا وہ
اس یار نگوڑے کو بلانا ہی پڑا تھا

جنگل میں پڑے رہتے تھے چندن کے وہ ٹکڑے
خوشبو کا انہیں بھاؤ بتانا ہی پڑا تھا

بے رنگ تھی دنیا غنی رنگین بنایا
ناچار یہ دل اس سے لگانا ہی پڑا تھا

لفظِ تازہ ایک دفتر کے برابر ہے ابھی
قطرہ اپنا بھی حقیقت میں سمندر ہے ابھی

کچھ گدازِ دل کا ہونا بھی ضروری ہے بہت
حسن آگے ہے نظر تیری میں زیور ہے ابھی

کیا بتائے کا مجھے پردیس میں کوئی خضر
بے خبر ان مسئلوں سے وہ سفر پر ہے ابھی

دیر ہے ملنے کی مجھ کو جو بہالے جائیگا
اک طلاطم خیز طوفاں دل کے اندر ہے ابھی

سلسلہ تیرا بھی مِلتا ہے بزرگوں سے غنی
میرو غالب تھے قلندر تو قلندر ہے ابھی

زاویہ یا نظر بہ طرزِ دگر
ہے بشر سر بسر بہ طرزِ دگر

پتھروں کی بھی آنکھیں ہوتی ہیں
دیکھتے ہیں مگر بہ طرزِ دگر

سیر کرتے ہیں کوہ و وادی کی
ہیں رُواں یہ شجر بہ طرزِ دگر

تیرگی میں ہے زندگی کی نمو
طے کیا ہے سفر بہ طرزِ دگر

مہر بھی تو طواف کرتا ہے
گردِ شوریدہ سر بہ طرزِ دگر

اس لئے ہارتا نہیں شاید
ہم سفر ہے مِرا یقیں شاید

دل دریچہ کُھلا رکھا میں نے
اِدھر آئے کوئی حسیں شاید

بند ہیں قُمقُمے حویلی کے
نیند میں کھو گئے مکیں شاید

سجدے پر سجدہ کر رہا ہوں میں
گھس ہی جائے گی یہ جبیں شاید

چل رہا ہوں بدل بدل کے روش
سامنے آئے وہ کہیں شاید

اپنی سے نہیں بڑھ کے کسی رُتبہ کی مٹی
کاشی کی بھی دیکھی ہے تِرے مکّہ کی مٹّی

بھر دے گی کسی روز یہی گور کو اسکی
جو زندہ اٹھائے پھرے ہے مُردہ مٹّی

اُگنے دو مجھے اپنے ہی صحرا میں کہ مجھ کو
آئے گی موافق نہ تِرے قریہ کی مٹّی

ہم جائے نشست اپنی سمجھتے ہیں مقدس
صوفی کے لئے جیسے کسی حجرہ کی مٹّی

ملتی ہے غنی طبع بشر کی بڑی حد تک
تھوڑی یہاں ہے تھوڑی وہاں فرقہ کی مٹّی

ابتدائی مرحلے میں ہی کوئی
سو گیا تھا جاگتے میں ہی کوئی

سب سے پوشیدہ رہا اس کا سفر
گُم ہوا تھا قافلے میں ہی کوئی

آکے منزل پر پتہ مجھ کو چلا
رہ گیا ہے راستے میں ہی کوئی

پر ملے تو آشیانہ جل گیا
مصلحت تھی حادثے میں کوئی

یاد اس کی شکل و صورت بھی نہیں
ہے کہیں اب واہمے میں ہی کوئی

اک ستارہ کس بلندی سے گرا ہے ہر جگہ
ریزہ ریزہ ہو گیا بکھرا پڑا ہے ہر جگہ

پھول کہتا ہوں اسے میں بھول جیسا ہے نہیں
نام کو اک نام اسکا رکھ دیا ہے ہر جگہ

تن بدن چٹیل ہُوا ہے کھیل کے میدان سا
اُگتے ہی سبزہ اُمیدوں کا جلا ہے ہر جگہ

نور نے چیرا کثافت کی تہوں کو تب کہیں
مختلف شکلوں میں آ کر وہ دِکھا ہے ہر جگہ

ایک صوتِ سرمدی آتی ہے ہراک ساز سے
دوسرا کوئی نہیں، واحد خدا ہے ہر جگہ

روپ دھارا ہے غنی ہریال کا اُس شوخ نے
تان کر سینا جو آندھی میں کھڑا ہے ہر جگہ

راستوں میں جو کچھ شجر ہوتے
اور آسان یہ سفر ہوتے

کب ہوئے وہ خدا مِرے ورنہ
شاہ رگ سے قریب تر ہوتے

کُھل گیا ہوتا جو دریچۂ دل
معبدوں میں نہ در بدر ہوتے

تنگ پگڈنڈیوں کے جال ہیں وہ
بڑھ گئے ہوتے رہگذر ہوتے

بام و در اُن کے چومتا میں غنی
اُڑ کے جاتا جو بال و پر ہوتے

تیز تر حافظے نہیں ہوتے
بھیڑ میں راستے نہیں ہوتے

قبر میں بے خبر پڑا مُردہ
ہم سے تو رابطے نہیں ہوتے

شہر میں جنگ کی سی حالت ہے
جنگ میں ضابطے نہیں ہوتے

کوٹھڑی سے نہیں نکلتا ہے
جیل میں حادثے نہیں ہوتے

مر گئے سب کرامتوں والے
اب یہاں معجزے نہیں ہوتے

ہمارے پاس فقط دردِ دل کرامت ہے
خدا کی خاص ہوئی ہم پہ یہ عنایت ہے

سناؤ نغمے محبت کے ساری دنیا کو
دلوں کو جوڑنا بھی کہتے ہیں عبادت ہے

چراغ جلتے ہی ان کی مخالفت کرنا
چہارسمت ہواؤں کی یہ سیاست ہے

بدل کے بھیس ہراک رنگ میں ہے وہ آیا
تُم اس کو پڑھ نہیں پائے نِری حماقت ہے

غیور جلتی ہیں اس کی ہی ہڈّیاں اس میں
غریب کے لیے دوزخ یہی جہالت ہے

چراغِ عقل لو دینے لگا تھا
بڑھاپے میں تو جینے کا مزہ تھا

بہت پیچیدہ میرا مسئلہ تھا
کہاں چھوٹا کسی سے یا بڑا تھا

مِرا خاکہ بگاڑا دوستوں نے
ہُوا تعریف سے یہ فائدہ تھا

میں باہر ڈھونڈتا تھا اُس کو لیکن
خزانہ میرے اندر ہی چھپا تھا

اٹھا کر اُس نے سینے سے لگایا
کھلونا طاق میں بے دم پڑا تھا

موجبِ صد عتاب ہیں دونوں
درد و غم کا حساب ہیں دونوں

بات سُنتے نہیں غریبوں کی
لکھنؤ کے نواب ہیں دونوں

جی حضوری میں دن گذرتے ہیں
کیا کروں یہ جناب ہیں دونوں

کشتی آرزو ہی ڈوب گئی
دیدۂ و دل چناب ہیں دونوں

ورقہ ورقہ خراب ہے اُن کا
زخم خوردہ گلاب ہیں دونوں

یا الٰہی نجات دے ان سے
دیدہ و دل عذاب ہیں دونوں

ورقے ورقے پہ دید لکھتا ہوں
سو اُمید و نوید لکھتا ہوں

پتھروں کو بھی پھوڑ دیتا ہے
عزم کو میں حدید*لکھتا ہوں

لہجۂ شاعری قدیم ان کا
باروایت جدید لکھتا ہوں

تیرے پہلو میں وقت جو گذرے
اس کو نوروز و عید لکھتا ہوں

لکھ چکا ہے بہت ظفر اقبال
اپنا قصّہ مزید لکھتا ہوں

صاحبِ حسن وہ، جلیل ابھی
صحبت اسکی تو ہے قلیل ابھی

آذرِ بُت تراش جاگے ہے
کار گہ میں نہ جا خلیل ابھی

نیند آتی نہیں کسی بھی طرح
ہے پریشاں تِرا علیل ابھی

حرص لپٹی ہے اُس کے پنجوں سے
بیٹھی مُردار پر ہے چیل ابھی

غنی بیمارِ عشق ہے تیرا
دل میں پیوست ہے یہ کیل ابھی

وقت اعلان کرتا رہا دیر تک
بھول انسان کرتا رہا دیر تک

زہر آلود کرتا تھا ماحول کو
دل پریشان کرتا رہا دیر تک

دیکھ کر ہنس پڑی ایک چیونٹی اُسے
کیا سلیماں کرتا رہا دیر تک

گاؤں والوں کو اُس نے کیا قید بھی
شہر سُنسان کرتا رہا دیر تک

باپ رے باپ ننّھا سپاہی غنی
سب کو حیران کرتا رہا دیر تک

ہمارے میکدے میں بٹتی یہ شراب صافی ہے
اسی سے مست رابعہ اسی سے مست حافی ہے

چلے بھی آؤ تم ہماری مملکت میں لوٹ کر
جو ہوگیا سو ہوگیا ابھی کھلی معافی ہے

تمہاری سادگی پہ سارے لوگ جان دیتے ہیں
یہ زیورات کا جو اہتمام ہے اضافی ہے

لبوں پہ سرخی کس لئے لگا کے آئے ہو صنم
ہمارے قتل کے لئے تمہارا سُرمہ کافی ہے

تمہارے واسطے ہیں دو جہاں کی نعمتیں بھی کم
ہمارے واسطے غنی خدا کا نام کافی ہے

کوئی خطرہ نہیں زوال نہیں
کس جگہ پر تِرا جمال نہیں

تیرے رخ سے طلوع ہوتا ہوں
تیرے رخ کی کوئی مثال نہیں

تجھ سے منسوب ہے مِرا اقبال
کوئی اندیشۂ زوال نہیں

بیکراں اک ہجوم ہے ہر سو
اُن میں کوئی تِری مثال نہیں

ہر نوالے پہ نام لیتا ہوں
ورنہ لُقمہ مِرا حلال نہیں

کوئی مجھ جیسا نہیں ہے سوچتا ہے خود خُدا
آئینے میں ایک چہرہ دیکھتا ہے خود خدا

قد کسی کا بڑھ نہ جائے اس کے سائے سے کہیں
ایک قینچی سے ہر اک سر کاٹتا ہے خود خدا

کُنجِ غفلت میں پڑی رہتی ہے دنیا بے خبر
عقل کی ہی روشنی میں جاگتا ہے خود خُدا

کوئی کوئی ہی سمجھتا ہے زباں عرفان کی
شاخِ سبز و برگِ گل میں بولتا ہے خود خدا

بند ہیں اس کی ہی مُٹّھی میں خزانے غیب کے
مِہر اپنی سے ہر اک در کھولتا ہے خود خدا

تیر تھے اور کمان راہوں پر
کتنے خالی مکان راہوں پر

انتظار ایک انتظار ترا
میں نے رکّھے تھے کان راہوں پر

چاند تارے زمیں پہ چلتے تھے
بچھ گیا آسمان راہوں پر

آندھیوں کے ہجوم میں کچھ لوگ
ڈھونڈتے تھے نشان راہوں پر

دور تک کوئی کارواں بھی نہ تھا
کس لئے دی اذان راہوں پر

رہتے ہیں سوچوں کے دفتر میں پڑے
بیٹھے ہوں اب یا کہ بستر میں پڑے

ٹین کے ڈِبّوں میں عورت بند تھی
مرد بھی دیکھے کنَستَر میں پڑے

پھول پھل اُس سے جُدا سب ہوگئے
جتنے سائے تھے برابر میں پڑے

میں نے دیکھے لوگ تیرے شہر کے
شُہرتوں ہی کے تھے چکّر میں پڑے

غوطہ خوروں نے کبھی کوشش نہ کی
رہ گئے موتی سمندر میں پڑے

نام کے سکّے چلاتے بھی تو کیا
پاؤں دھرتی پر جماتے بھی تو کیا

خاک اندر خاک آخر مل گئی
خود کو ہم اونچا اڑاتے بھی تو کیا

غیر ممکن تھا پسیجے کوئی دل
داستاں رو کر سناتے بھی تو کیا

چل رہی تھی ہر طرف بادِ سموم
پھول صحرا میں اُگاتے بھی تو کیا

اوڑھ لی خود ہم نے چادر برف کی
آبشاروں کو جگاتے بھی تو کیا

اون کے موزے پہن کر آئے چور
کان آہٹ پر لگاتے بھی تو کیا

تِری جادوئی نظروں کا اثر ہے
کہ ٹھہری اک جگہ میری نظر ہے

نہیں تفریق کوئی اس میں باہم
مِرا دلبر مِری جان و جگر ہے

مقامِ عشق آگے ہے خرد سے
کہاں زاہد تجھے اس کی خبر ہے

نہیں رُکتا مسافر اک جگہ پر
ہماری زندگی ایسا سفر ہے

زمینِ دل ہوئی ہموار یارب
تِری توفیق سے پھولا شجر ہے

تِری نگاہ مِرے سر پہ سائباں مولا
زمین پست ہوں میں اور تم آسماں مولا

شکستہ ناؤ اگر چہ ہے بیچ دریا کے
تمہارا اسم حقیقت میں بادباں مولا

تمہارا عشق ہے آبِ حیات کا چشمہ
یقین دل کو ہے میرے یہی گماں مولا

رُخِ مبین سے مِلتی ہے روشنی سب کو
ہے عام فیض تمہارا یہاں وہاں مولا

کِیا اشارۂ ابرو سے زیر دشمن کو
شہاب تیر فلک ہے تِری کماں مولا

خواب میں پیمانے ٹکرائے بہم کیا یا خدا
مست آنکھوں کا وہ منظر دل رُبا تھا یا خدا

میز پر رکھا ہوا پیالے پہ پیالہ یا خدا
صبح کو جاگے تو دیکھا یہ تماشا یا خدا

کعبہ سے اس نے خریدا ہے سیہ ملبوس یہ
خالِ مشکیں عہدِ نو کا خلیفہ یا خدا

ہاتھ دھو بیٹھے حیات و آفرینش سے ہمیں
اپنا بستر یار نے تھا جو لپیٹا یا خدا

ہر بصارت سے ورا ہے جو بصیرت سے پرے
کوئی مورت حسن کی ہم کو دکھاتا یا خدا

زمیں پہ سبزہ کہیں آسماں میں تارے ہیں
مِری کتابِ مقدّس کے یہ ستارے ہیں

تمہارے پاس فریضے ہیں منصبی تو کیا؟
تمام عارضی ہیں سب کے سب ادھارے ہیں

کئی زبانیں کئی گھر کئی پُجاری یہاں
جہاں میں بج رہے ارداس کے نگارے * ہیں

خدا جدا نہیں اپنی صفات سے ہر گز
ہوا وصال ہمیں بھاگیہ ہمارے ہیں

ابھی قیامتِ کُبریٰ نہیں ہوئی برپا
جواں محبتیں ہیں زندہ بھائی چارہ ہیں

بے حساب و بے تحاشا ہے زباں
پتّھروں کے منہ میں سبزہ ہے زُباں

ہم سمجھتے ہیں زبانیں حسن کی
عشوۂ یار و سراپا ہے زُباں

رنگ ہیں پھولوں کے اشعارِ غزل
ہر چمن میں اک تماشا ہے زباں

داستاں ریگِ رُواں ہے جا بجا
دشت و صحرا ذرّہ ذرّہ ہے زباں

موج کا جھرنے کا افسانہ الگ
جوشِ دریا قطرہ قطرہ ہے زباں

تِرے گھر شوق سے جانا سفر ہے اور سفر کیا ہے
سہی قامت ہی اک بالا شجر ہے اور شجر کیا ہے

عبادت کے لئے محراب ہے پیشِ نظر ابرو
زیارت چہرے کی کرنا نظر ہے اور نظر کیا ہے

سوائے لوتھڑے کے یہ نہیں ہے چیز کوئی بھی
پرائے غم جو سہتا ہے جگر ہے اور جگر کیا ہے

بہت مشہور ہیں فتح و ظفر کی داستانیں بھی
دلوں کو فتح کرنا ہی ظفر ہے اور ظفر کیا ہے

خیالِ خاص جو اندر ہی اندر پکتا رہتا ہے
غنی اظہار کی قدرت ہنر ہے اور ہنر کیا ہے

صفا اپنی جگہ پر ہی نہیں مروا بھی غائب ہے
کہاں ہے کس طرف ہے کیا خبر کعبہ بھی غائب ہے

جمالِ یار کی تازہ بہاروں میں گھرا ہوں میں
نہیں دربان کوئی آخری پردہ بھی غائب ہے

نمازِ غائبانہ پڑھ رہے ہیں لوگ کس کی یہ
فرشتے دم بخود ہیں سب کے سب عرصہ بھی غائب ہے

غموں کی دھند چھائی ہے جمالِ سبز پر اے دوست
تِرا عُشوہ بھی غائب ہے تِرا نخرہ بھی غائب ہے

چھتوں سے اڑ گئیں امن و اماں کی سب ابابیلیں
مقدّس دن بھی غائب ہے شبِ اَسریٰ بھی غائب ہے

کوئی روکو کہ پہلو سے چلا ہے دل
کرے گا مجھ کو بھی رُسوا بڑا ہے دل

کرے گی پاؤں کی ٹھوکر اسے زندہ
گلی میں یار کی جو گِر پڑا ہے دل

ہماری دھڑکنیں یہ کہہ رہی ہیں اب
جہانِ رنگ و بو سے بھی بڑا ہے دل

نہیں سود و زیاں کی بھی اسے پروا
جلائے گا جہانوں کو جلا ہے دل

غنی دیر و حرم سے لوٹ آیا ہے
مقابل آئینے کے اب کھڑا ہے دل

دل بہ عُنوانِ فضا بھیجتا ہوں
سب کے سب ارض و سما بھیجتا ہوں

اپنے ہی کھاتے میں لکھتا ہوں خطا
تجھ کو نیکی و صلا بھیجتا ہوں

وہ نہیں سُنتے ہیں فریاد کبھی
انکساری کی ادا بھیجتا ہوں

حسنِ ظن کا ہے یہ عالم کہ میں اب
رائگاں کشتِ خطا بھیجتا ہوں

تیرا احسان ہے جیسا بھی ہے یہ
میں بُرا اور بھلا بھیجتا ہوں

دھول سے یہ اٹے ہوئے رستے
کیا ہوئے جو بڑے ہوئے رستے

ایک سے دوسرا نکلتا ہے
منزلوں سے کٹے ہوئے رستے

ڈوبے رہتے ہیں حیرتوں کے بیچ
اک جگہ پر کھڑے ہوئے رستے

سردیوں گرمیوں کی یورش سے
ہر قدم پر جلے ہوئے رستے

فصلِ باراں میں کون گذرا ہے
اور بھی جو ہرَے ہوئے رستے

چہکتے گلوں میں ملاحت تِری
بیاں کوئلوں نے کی وحدت تِری

نظامِ جہاں کو چلاتا ہے تُو
ملی آدمی کو نیابت تِری

نگوں سار باغِ بدن ہے مِرا
ملی نہرِ جاں سے رطوبت تِری

یہی چاہیئے جاہ و رُتبہ مجھے
جہاں سے ہے بڑھ کر رفاقت تِری

کِیا تو نے روشن چراغِ حیات
تو ثابت سدا اک حکومت تِری

دل سراپا چشم میرا، چشمِ بینا دل ہوئی
کامرانی کیا جہانوں کی مجھے حاصل ہوئی

دی گواہی مُرغ نے یہ صبح کو احوال کی
کیا ہُوا، جانے بھی دو خلقت اگر غافل ہوئی

ایک دنیا نے مجھے تجھ سے ملایا یا خدا
ایک دنیا میرے تیرے درمیاں حائل ہوئی

یہ بدن نعمت ملا تھا در سے تیرے بالخصوص
کیا کمی ہے یا الٰہی اک عطا زائل ہوئی

دل سے دل کو راہ ملنا تھی غنی سو مل چکی
تُو ہُوا مائل طبیعت میری بھی مائل ہوئی

بھری ہے زمیں اور بھرا آسماں ہے
کوئی بھی جگہ تجھ سے خالی کہاں ہے

لبِ جان سے پھوٹتی ہیں شعائیں
گُہر نام کی برکتوں سے زباں ہے

سفر کر رہا ہے خلاؤں میں بھی تو
کہ روشن ترے پاؤں سے کہکشاں بھی ہے

عجب تیر برسا رہا ہے قضا کے
ترے ہاتھ میں کُن فکاں کی کماں ہے

دلوں کا سکوں اور آنکھوں کی ٹھنڈک
کرم کرنے والا غنیؔ مہرباں ہے

ہمیں پتہ ہی نہیں کچھ فرات کا مطلب
مناسبت کا کسی التفات کا مطلب

پڑے تھے صحن میں معبد کے سر بریدہ سب
کُھلے تھے اُن کے کف و جیب گھات کا مطلب

کسی کی پیاس نہیں بجھنے والی اب کے یہاں
یہی سمجھ میں ہے آتا فرات کا مطلب

جلائے کس نے ہزاروں چراغ بے مصرف
چراغ بانی کی ظلمت نے رات کا مطلب

لٹادیا تھا انہوں نے سبھی اثاثہ غنی
وہی سمجھتے تھے بہتر زکات کا مطلب

ہم نے اوڑا گگن نہیں ہوتا
کائنات اک بدن نہیں ہوتا

راز مرجاتے اس کے سینے میں
جو کلی کا دَہن نہیں ہوتا

رات دن جو سفر میں ہےخوشبو
راہرو کا وطن نہیں ہوتا

یعنی تیرے ظہور سے ہے بہار
یہ چمن بھی چمن نہیں ہوتا

پھول کو پھول ہے کِیا تُو نے
یاسمن تو سمن نہیں ہوتا

معجزہ تیرے بانکپن کا ہے
خُلد کیا شے عدَن نہیں ہوتا

دردِ دل یہ دکھاؤں اور پھر میں
دل کی دھڑکن سناؤں اور پھر میں

دل کی کھڑکی پہ دوئی کا پردہ
فرض کیجے سجاؤں اور پھر میں

مجھ سے ایسا کبھی نہیں ہوگا
دل کسی کا دُکھاؤں اور پھر میں

تیرا احساں ہُوا ہے مجھ پر خاص
سر کہیں اور جھکاؤں اور پھر میں

غنی احساں کی ہے جزا احساں
تیری آیت بھلاؤں اور پھر میں

سبزۂ حسن مبارک ترے رخساروں کو
یونہی ملتا رہےروزینہ نگہ داروں کو

اک خموشی ہے یہاں دشت وبیاں میں اُف
اب لگی کس کی نظر شوخ سے نظّاروں کو

بسترِ ہجر پہ بل کھاتے ہوئے عمر ہوئی
اور کیا چاہیئے ہم عشق کے بیماروں کو

کم ہی ملتی ہے یہ توفیق کسی کو اب کے
کب مناتا ہے کوئی روٹھے ہوئے یاروں کو

عاجزی سا تو نہیں عیب کوئی دُنیا میں
حال تک کوئی نہیں پوچھتا بے چاروں کو

رفعتوں کے وہ سب راستے بند ہیں
جائیں بھی تو کہاں حادثے بند ہیں

لوگ دُہرا رہے ہیں پُرانی کتھا
فہم و ادراک کے قافیے بند ہیں

ایک استھان کا کر رہے ہیں طواف
وہم کے غار میں قافلے بند ہیں

عقلمندوں کو پاگل سمجھتے ہیں لوگ
خلوتی ہوگئے رابطے بند ہیں

خبطیوں کی ہے کیوں برتری ہر طرف
شہرِ ناقدر میں نابغے بند ہیں

میں تیرے نام کی مُہریں بناؤں گا
جو تیرا نام لیں قومیں بناؤں گا

کئی خوشبوؤں کو باہم ملا کر میں
نئے وعدہ نئی قسمیں بناؤں گا

کئی پامال و فرسودہ نظاموں کو
مٹا کر میں نئی رسمیں بناؤں گا

نہیں کچھ واسطہ منسوخ قرنوں سے
نئی صبحیں نئی شامیں بناؤں گا

پرانی کرسیوں کی ہل گئیں ٹانگیں
نئی کرسی نئی چولیں بناؤں گا

جتنا اوپر بڑھا ہوا ہے میاں
اُتنا نیچے دھنسا ہوا ہے میاں

بیچ دھرتی کے ہیں جٹائیں سب
پیڑ اُلٹا کھڑا ہوا ہے میاں

سر گڑھے میں ہے ٹانگیں اوپر ہیں
بیچ میں دھڑ ٹنگا ہوا ہے میاں

تونے شاخوں پہ آنکھ گاڑی ہے
پھل جڑوں میں چُھپا ہوا ہے میاں

دے رہا ہے بشارتیں سبزہ
خاک میں زر دَبَا ہُوا ہے میاں

دن ہفتہ مہینہ کوئی دیوے تو بُرا کیا ہے
جینے کا قرینہ کوئی دیوے تو بُرا کیا ہے

کوئی بھی مداوا نہیں اب تیرے فقیروں کو
اک نانِ شبینہ کوئی دیوے تو بُرا کیا ہے

مکّار ہوں زاہد بھی مجھے صدقہ کی نیّت سے
گر بوسہ حسینہ کوئی دیوے تو بُرا کیا ہے

انگشتری خالی کو عنایت کی نظر سے وہ
پُر نور نگینہ کوئی دیوے تو بُرا کیا ہے

غیروں سے نہیں ہے کوئی رغبت غنی عارف کو
عرفاں کا خزینہ کوئی دیوے تو بُرا کیا ہے

جو نہ دیکھا تھا دیکھتا ہوں میں
دل دریچے کو کھولتا ہوں میں

ہائے افسوس روشنی کے لئے
شہرِ ظلمت میں دوڑتا ہوں دیر میں

شاعری کھیل چند لفظوں کا ہے
کونسے موتی رولتا ہوں میں ؟

اپنی ناؤ کو اک سمندر میں
کچّے دھاگے سے کھینچتا ہوں میں

علم ناقص ہے تجربہ کے بغیر
تجربہ کار ڈھونڈتا ہوں میں

کم پڑے حَجم تو سوچنا چاہئے
ظرف کو دیکھ کر مانگنا چاہئے

دشمنوں سے ملے مطلبی دوست سب
مجھ کو میدان سے بھاگنا چاہئے

اس کی تہ میں پڑے ہیں خزانے بہت
تیرنے والے کو ڈوبنا چاہئے

دوست ہے وہ اگر، فرض ہے آپ کا
خود کشی سے اُسے روکنا چاہئے

رات کے وقت تنہا ملوں گا غنی
رات کو ہی مجھے ڈھونڈنا چاہئے

تو کیا ہُوا؟ خوں جلا ہے سب کا سب آبلوں میں
قدم قدم پر ہے روشنی پھیلی راستوں میں

عجیب شے ہے طمانیت اور صفائی دل کی
سکوں برستا ہے تیرہ و تار جھونپڑوں میں

یہ کس کی سانسوں سے گُدگُدی ہو رہی ہے دل میں؟
یہ کس کی دھڑکن سے جان آئی ہے دھڑکنوں میں

قدم قدم سے ملا نہ ہی زاویہ نظر کا
یونہی وہ لشکر نہیں بٹا لاکھ ٹکڑیوں میں

مصیبتوں میں جو کام آئیں وہ سچّے ہیں دوست
کہ مطلبی ساتھ چھوڑ دیتے ہیں مشکلوں میں

روزِ افزوں حسنِ دلبر سے مجھے ڈر لگتا ہے
کانپتا ہوں میں کنارے پر سمندر لگتا ہے

کس لئے تو حوصلہ دیتا ہے مجھ کو اے طبیب
حال اپنا مجھ کو پہلے سے بد تر لگتا ہے

جسم تیرا فصلِ گل میں باغ ہے کشمیر کا
ناچتے ہیں طائروں کے جُھنڈ اکثر لگتا ہے

انکساری سے زمیں پر سایہ پڑتا ہے ترا
قد اگر کھینچے فلک سے جا ترا سر لگتا ہے

معبدوں پر میں نے دیکھے ہیں عقیدوں کے غلاف
اک مثالِ سادگی مجھ کو ترا گھر لگتا ہے

کبوتر گولیوں کی زد سے اونچا
اڑے گا پھر خطِ سر حد سے اونچا

نہیں پابندِ حرف و صوت کا بھی
الف اور لام کی ہے مد سے اونچا

دکھائی دے رہا اُس طرف بھی
مِرا قد پربتوں کے قد سے اونچا

مِرے قد کو گھٹاتا ہے ثنا خواں
کہ میں ہوتا ہوں ردّ و کد سے اونچا

قواعد میں نہیں املا کے اندر
عروضی کی بھی شدّومد سے اونچا

رہے گا نام زندہ بعد مُردن
ہے کتبہ صاحبِ مرکز سے اونچا

دعا دینا پڑے گی زندگی کو
تھکے ماندے ہوئے ہر آدمی کو

سمجھتے ہیں غزل کے فن کو ہم بھی
پڑھا ہے میر غالب مصحفی کو

عَبَث کی نثری نظموں کی حمایت
بھلا کر شعریت اور نغمگی کو

ردیف و قافیہ، پابندیِ بحر
جلا دیتا ہے فن ہی شاعری کو

تجسس اجتہاد و بے ریا عشق
ذکاوت راس آئی شافعی کو

مجھے تسبیح کے دانے گھمانے سے نہیں مطلب
بہ آوازِ بلند اس کو بلانے سے نہیں مطلب

نبھاتا جا رہا ہوں میں فرائض منصبی اپنے
صلے کی بھی نہیں پروا زمانے سے نہیں مطلب

عمل کی کارگہ کا آدمی ہوں بر سرِ پیکار
کسی جنگل میں جا دھونی رمانے سے نہیں مطلب

کسی دہلیز کے پتھر پہ ماتھے کو نہ رگڑوں گا
عبث ہی آبرو اپنی گنوانے سے نہیں مطلب

کسی کا آستاں اونچا ہے تو اونچا ہی رہے دائم
غنی آگے کسی کے سر جھکانے سے نہیں مطلب

ارزاں تھے کس قدر وہ بہت سستے سستے تھے
ٹکر وہ مارتے تھے ہمیں بکرے بکرے تھے

دھاگوں کے ٹوٹنے سے تھا گھبرا گیا یہ دل
اک روز ٹوٹ ہی گئے سب رشتے رشتے تھے

ان نے تو پھینکے جھیل میں پتھر مذاق سے
مالا مری وہ توڑ گئے، بچّے بچّے تھے

آنکھوں کو بند کرکے سفر کر رہا تھا میں
شہراہ شاہراہ تھی اور رستے رستے تھے

مجھ کو پسند ہی نہ تھی انکی روش غنی
وحدت کی ڈور کاٹ گئے فرقے فرقے تھے

بتّی جو موم کی تھی وہاں جل کے بُجھ گئی
سَودا سُلَف سمیت دکاں جل کے بُجھ گئی

خاکستر و سیاہ جو وردی دکھائی دی
اک شمع کی طرح مری جاں جل کے بُجھ گئی

جہلم میں کوئی بہتی ہوئی شے دکھائی دی
کہنا تو چاہتا تھا زباں جل کے بُجھ گئی

سوچا تو تھا کہ اہلِ جہاں کو جگائیں گے
الفاظ آتشیں تھے فغاں جل کے بُجھ گئی

انجام ظالموں کے ہوتے ہیں برے، غنی
جو آگ میں گری تو کماں جل کے بُجھ گئی

مظہرِ جاں اے شاہکار سنو
ایک ہی تم کہو ہزار سنو

کس لئے کر رہے ہیں دامن کو
خاک آلود و داغدار سنو

تم کہ غازی سمجھتے ہو خود کو
کرتے ہو مکھیاں شکار سنو

شاعری آگے کی ہے چیز کوئی
کاٹھ کے گھوڑے کے سوار سنو

سرِ دل کیجئے حضور مرے
چین آ جائیگا قرار سنو

گرچہ محنت نہ کی ہے کچھ میں نے
آگیا شعر پر نکھار سنو

ہار ہیں موتیوں کے یہ اشعار
لفظ ہر اک ہے آبدار سنو

یہ زمیں سبز ہے شفق☆ کی غنی
کیا کمی تھی جو لی ادھار سنو

زندگی گر ہزار بار ملے
ہے دعا تو ہی بار بار ملے

ایک ہی بات ہے نہیں کچھ فرق
تو نہیں تیرا انتظار ملے

فصل گل کی ہیں رونقیں تجھ سے
باغ ، تُو، سایۂ چنار ملے

زندگی اضطراب میں گذرے
غم ترا مجھ کو پائدار ملے

بعد مدّت کے جو ملے تجھ سے
آنکھ اس کی ہو اشکبار ملے

دوستوں کی ہزار قسمیں ہیں
غنی مٹی کوئی غبار ملے

بام پر ماہتاب باقی ہے
جام میں کچھ شراب باقی ہے

نام تیرے جو مُنتَسِب ہو گی
وہ غزل کی کتاب باقی ہے

کشتی مہ رواں ہے جہلم میں
آبِ سردِ چناب باقی ہے

تم نے کٹوائی ہے ٹِکٹ لیکن
دوست میرا حساب باقی ہے

کر چکا ہوں سوال تجھ سے دوست
ایک تیرا جواب باقی ہے

تم نے دیباچہ پڑھ لیا شاید
اور پڑھنا کتاب باقی ہے

ابھی دنیا کے غم ہی دیکھے ہیں
آخرت کا عذاب باقی ہے

زخم خوردہ ہے باغ آئے گا
اک مہکتا گلاب باقی ہے

قطعہ

خود رسولِ خدا نے تھا انکو
دے دیا یہ خطاب باقی ہے

کیا بتاؤں میں کس قدر اونچا
رتبۂ بو تراب باقی ہے

حرفوں کے گیند روشنی میں سوچتا رہا
شیرینیاں سی تیرگی میں سوچتا رہا

تائید کی ملی کہاں توفیق اس لئے
انکار کی ہی چاندنی میں سوچتا رہا

لاچار تھا مریض کہیں رہ گزار میں
جنت کے خواب ماندگی میں سوچتا رہا

کب آئے گی بہار نئے استعارہ کی
شاعر لباسِ کاغذی میں سوچتا رہا

گھورے پہ جو اُگا تھا غنی پھول سا بدن
کیا کیا نجانے سادگی میں سوچتا رہا

زیر و بم ہے اسی لئے شاید
تکُ☆ میں دم ہے اسی لئے شاید

تشنگی بڑھ گئی ہے میرے دوست
جُو ❊بھی کم ہے اسی لئے شاید

جانور خود کشی نہیں کرتے
عقل کم ہے اسی لئے شاید

موسمِ دل بدل گیا ہے کچھ
آنکھ نم ہے اسی لئے شاید

دھندلی دھندلی ہے کائنات غنی
دل میں غم ہے اسی لیے شاید

چیونٹی کا خوں کُھول گیا
دشمن رستا بھول گیا

قیمت ساری سانس کے ساتھ
نکلی جب وہ مول گیا

روٹی ملتی مفت میں تھی
قانوں اگلا رول گیا

رشوت کے در بند ہوئے
دل دل میں ترسول گئے

مایوسی ہے کفر غنی
پنکھے سے وہ جھول گیا

بچّہ اب جاگنے ہی والا ہے
خواب تو ٹوٹنے ہی والا ہے

تیز قدمی سے ڈر گیا میری
راستہ روکنے ہی والا ہے

ساتھ لے جائے گا یہی دو گز
وہ زمیں بانٹنے ہی والا ہے

دے دیا ہے جواب ہمت نے
وہ بھی تو بھاگنے ہی والا ہے

فیتہ لے کر کھڑا ہے بونا شخص
قد مِرا ماپنے ہی والا ہے

میری آنکھیں خشک تھیں لیکن بدن روتا رہا
صاف تھا مطلع مگر پھر بھی چمن رو تا رہا

ظاہری نسبت ، نہ ہی رشتہ سخن ور سے مگر
یاد میں اُس کی سمندر موجزن روتا رہا

خوش تھی شیریں سیرِ گلشن جو کیا پرویز ساتھ
یہ تھی قسمت کی خرابی، کوہ کن روتا رہا

آ گئی واپس نظر تھی پیرِ کنعاں کی مگر
حضرتِ یوسف سے بچھڑا پیرَہن روتا رہا

واسطہ رہتا تھا اسکو اک نہ اک مردہ سے روز
تھی بسر اچھی مگر وہ گورکن روتا رہا

کاٹ کر جیبیں اپاہج شخص کی پھر کس لئے
گوشۂ تنہائی میں اک راہزن روتا رہا

ساتھ ہی صیّاد کے آنکھیں گئیں اس کی غنی
کوہ و وادی مارا مارا اک ہرن روتا رہا

اندھا ہوں میں آنکھیں اُگی ہیں چھڑی سے
مجھے پڑ گیا کام ہے زندگی سے

ملوں گا میں فٹ پاتھ پر کھمبے کے پاس
گدا ہوں پتہ پوچھ لو بے کسی سے

تکلّف کو سمجھے ہے سچ بے تکلّف
کہا اس نے تھا مجھ کو اپنا ہنسی سے

ہوئے منحرف کب روایت سے ہم لوگ
دعا ہے بچا ئے خدا گمرہی سے

حرم سے ملے دیر سے یا کہیں سے
ہمیں تو فقط کام ہے روشنی سے

میرے دل جاں میں یہ سماتے ہیں
لفظ مجھ کو پسند آتے ہیں

روشنی بانٹتے ہیں سب کے سب
کالے جامے پہن کے آتے ہیں

اپنی اپنی نشست اور بیٹھک
اپنی اپنی رکابی کھاتے ہیں

سیدھے ہاتھوں میں لاٹھیاں ہیں اور
اُلٹے ہاتھوں میں انکے چھاتے ہیں

ان کے بھی خاندان ہوتے ہیں
باہمی انکے رشتے ناطے ہیں

ہم سے تو اب جیا نہیں جاتا
چولا اپنا سِیا نہیں جاتا

ہم کو آسانیوں نے مار دیا
کام مشکل کِیا نہیں جاتا

سچ کتابوں میں دفن ہے ہم سے
تلخ شربت پیا نہیں جاتا

لینے کا سو بہانہ دنیا میں
دان ہم سے دِیا نہیں جاتا

غلبہ ہے ہر جگہ رقیبوں کا
نام اُس لیا نہیں جاتا

کچھ لوگ خوش ہیں ساروں کے ساروں کو بیچ کر
ہم نے لیا نہ چاند ستاروں کو بیچ کر

پچھتائے گی وہ قوم بہت بھگتے گی سزا
خوش ہے جو اپنے گھوڑسواروں کو بیچ کر

معصوم بچّے پھرتے ہیں گلیوں کے بیچ میں
بھرتے ہیں اپنے پیٹ غباروں کو بیچ کر

نقلی دوائیں شہر میں بکتی ہیں خوش ہیں وہ
سرسام اور کوڑ کے ماروں کو بیچ کر

کچھ لوگ ہیں جو چرب نوالے چبھاتے ہیں
مُردوں سے مانگتے ہیں مزاروں کو بیچ کر

سویرے اپنی منزل کی طرف تنہا چلا ہوگا
سفر ہر روز طے مشرق سے تا مغرِب کِیا ہو گا

نہ ڈر اے نیم جاں قطرے تُو جاری رکھ سفر اپنا
سمندر سے ملے گا جس گھڑی بے انتہا ہوگا

جزا کی بھی تمنّا کر نہ تُو اس دارِ فانی میں
بھلائی کرنے والے سُن وہاں تیرا بھلا ہوگا

جو بوئے گا وہی اس کو ملے گا کاٹنے کو بھی
سخاوت سے سخی کا مرتبا اور بھی بڑا ہوگا

مِرے ماضی نے بہتر حال کی بنیاد ڈالی تھی
یقیناً حال کے کندھے پہ مستقبل کھڑا ہوگا

ہمارے اور انکے درمیاں پردا نہیں ہوگا
کسی کا خُلد میں اپنی طرف رستا نہیں ہوگا

کسی کا دل پسیجے گا نہ ہی امید بھی ہوگی
عذابِ یادِ ماضی اور وہاں فردا نہیں ہوگا

جسے کہتے ہیں عُرفِ عام میں ہنگامۂ محشر
بغیر انسان کے ممکن نہیں برپا نہیں ہوگا

" وہی رفتار بے ڈھنگی جو پہلے تھی سو اب بھی ہے"
کہ شاخِ خشک ہے واعظ کبھی سیدھا نہیں ہوگا

خدایا خُلد میں واعظ کرے گا فعل نازیبا !
ملے گی ہر سہولت مفت میں خرچا نہیں ہوگا

یہ صدا آئی دل کے اندر سے
ہمیں لینا ہے کیا سکندر سے

ڈر نہیں خشک ہونے کا مُجھ کو
رابطہ ہے مِرا سمندر سے

موسمِ زرد میں ثمر آئے
کچھ ذیادہ مِلا مقدّر سے

شِمر معلوم ہے تجھے ظالم!
خوں ٹپکتا ہے تیرے خنجر سے

دستِ عبّاس چوم لے اے غنیؔ
تو لپٹ جا گلوئے اصغر سے

حالتِ کشمیر پر آنسو بہا
اے قضا شمشیر پر آنسو بہا

لوگ آسودہ نہیں دیکھے غریب
درد کی تصویر پر آنسو بہا

چیر ڈالا تھا گُلو مظلوم کا
حُرملہ کے تیر پر آنسو بہا

فاطمہ دلگیر کی باتیں کریں
مسئلہ جاگیر پر آنسو بہا

وہ بڑے مظلوم ہیں اِس دور کے
مصحف وتفسیر پر آنسو بہا

گذر گیا کہ وہ بچپن عجب زمانہ تھا
"وہ شاخ ہی نہ رہی جس پہ آشیانہ تھا"

امیر لوگ عموماً تھے سنگ دل لیکن
کسی کسی کا لب و لہجہ مشفقانہ تھا

تِرے حضور میں حاضر ہوئے، غنیمت تھی
یہی نماز ہماری یہی دُگانہ تھا

کوئی غریب نہ تھا، گانٹھ کھول دیتا جو
کوئی کمی نہ تھی دل میں ہراک خزانہ تھا

ہمارے پاس کھڑے تھے درانتیوں والے
ہمارے کھیت میں پھر سرخ دانہ دانہ تھا

جو مٹ چکا اُتارنے کا فائدہ نہیں
اس نقش کے ابھارنے کا فائدہ نہیں

کچھ سنتے ہی نہیں ہیں یہ مُردے تو مُردے ہیں
سو بار بھی پکارنے کا فائدہ نہیں

تُو کس خیال میں ہے کوئی اور کام کر
قبروں کو تو سنوارنے کا فائدہ نہیں

جو عزم و حوصلہ ہے تو مُردوں کو زندہ کر
جو خود مرے ہوں مارنے کا فائدہ نہیں

چھوٹی پڑے نہ تیرے بدن پر ردا غنی
پاؤں بہت پسارنے کا فائدہ نہیں

محبتوں میں کسی کو خدا بناتے ہوئے
عقیدتوں کے جہاں کو نیا بناتے ہوئے

ہرایک خاکہ میں بھرتا ہے رنگ سو سو وہ
جدا ہے سب سے سبھی کو جُدا بناتے ہوئے

عجیب ذات ہے زردار سے بھی مِلتا ہے
غریب کے بھی ہے دل میں جگہ بناتے ہوئے

وہ سورجوں کو بجھاتا ہے اپنی پھونکوں سے
مِرے گھروندے میں بیٹھا دیا بناتے ہوئے

قدیم کاری گری عام صنعتیں اسکی
گلیم ،بُرد غنی وہ قبا بناتے ہوئے

بند کیں آنکھیں بہانہ خوب ہے
یار تیرا آزمانہ خوب ہے

موجِ دریا گا رہی ہے دیر سے
ایک ہی دھن میں ترانہ خوب ہے

رات دن یہ سلسلہ چلتا رہے
تیرا آنا اور جانا خوب ہے

زیست حرکت کے سوا کچھ بھی نہیں
دل کی دھڑکن تازیانہ خوب ہے

شاخِ بالا پر مبارک ہے تجھے
طائرِ جاں آشیانہ خوب ہے

دہلی میں لا کے لاہور ڈالو
لاہور میں دہلی اور ڈالو

ممکن ہے جاگیں سب کے مقدر
مردہ دلوں میں کچھ شور ڈالو

دریا سمندر کو جاتے ہیں سب
غزنی بھی اس میں سب غور ڈالو

لڑنے کے گُر بھی ان کو سکھا دو
چوروں پہ تُم اپنے مور ڈالو

فرصت کہاں پھر ایسی ملے گی
کرنا ہے جو کر فی الفور ڈالو

کہتی یہ مجھ سے گوپن ہے
دریا دریا تِرا جوبن ہے

دل میں وفا آنکھوں میں آنسو
انساں نہیں ہے تو درپن ہے

پانی جیسے بدن تیرے نے
من مچھلی کو دیا جیون ہے

بستی بستی ہوئی ہے روشن
اک سایہ آنگن آنگن ہے

شر مایا ہوگا تجھ سے وہ
بھاگے سنیاسی بن بن ہے

ضد کرنا ہے اُس کی عادت
اڑچن پر ڈالے اڑچن ہے

بھارت گلشن کی چڑیاں ہم
اپنا ترانہ جن گن من ہے

شہرِدل ویراں علاقے اجنبی لگتے رہے
سارے مطلب کے تھے رشتے اجنبی لگتے رہے

جسم ہوتا تو نشاں کوئی ہمیں ملتا ترا
مسجدیں اور سب کلیسے اجنبی لگتے رہے

دیر تک سایہ کسی کے ساتھ رہتا ہی نہیں
جُزوِ وقتی تھے سہارے اجنبی لگتے رہے

آشنا ان میں نہ تھا کوئی ہمارا ہم نوا
چہرے مُہرے سب کنایے اجنبی لگتے رہے

ساتھ دریا کے نہیں چلتے کنارے بھی غنیؔ
ان کو موجوں کے اشارے اجنبی لگتے رہے

بازیابی کا عمل، یہ مسئلہ درپیش تھا
بیچ دلدل کے کنول یہ مسئلہ درپیش تھا

کام کوئی بھی کہاں اچھے طریقے سے کِیا
کثرت و طولِ امل یہ مسئلہ در پیش تھا

ہم بھی کرتے شاعری اچھی مگر الجھے رہے
گہ رَجَز گاہے رَمَل یہ مسئلہ درپیش تھا

آنسوؤں کی دھند میں خوش چہرہ مخلوقِ خدا
ہر طرف جنگ و جدل یہ مسئلہ درپیش تھا

ٹرٹراتا زاغ ہے برسات میں چُپ کوئلیں
ڈالتا ہے وہ خلل یہ مسئلہ درپیش تھا

سبز شاخِ ہنر رہے گی سبز
سبز لکّھے گی اور پڑھے گی سبز

سبز موسم ہے پیچ و بل کھاتی
پیڑ پر بیل بھی چڑھے گی سبز

لہر دوڑے گی ساتھ نظروں کے
خانۂ دل کو بھی کرے گی سبز

سبزہ سبزہ جئے گی سبز پری
ذائقہ زیست کا چکھے گی سبز

ٹوٹ جائیں گی خشک شاخیں غنی
موڑنے پر یہی مُڑے گی سبز

ادائے خوب ہے تسکین ہے تماشا ہے
تو کائنات کی تفصیل یا خلاصہ ہے

فروغِ صبح سا چہرہ ردائے شب زلفیں
نگاہِ ناز کہیں کم کہیں زیادہ ہے

رہے نشیب میں ہی ڈھونڈتے تن آساں لوگ!
بلندیوں پہ ہی اُڑتا ترا پھریرا ہے

ہمیشہ بیٹھی رہی گردِ کوتہ ہمّت کی
خمار کوئی نہ دعویٰ، نہ ہی تقاضا ہے

بدن پہ گرد جمی پپڑیاں ہیں ہونٹوں پر
سُلگتی سانس دھواں اورسفر اثاثہ ہے

فریاد وظیفہ و دعا بھول گیا ہوں
حیرت زدہ ہوں طرز و ادا بھول گیا ہوں

آتا ہے خدا بھی تِرے دیکھے سے مجھے یاد
جب سے تُو گیا ذکرِ خدا بھول گیا ہوں

منظورِ نظر تیری رضا جب سے ہوئی ہے
امّیدِ جزا ، خوفِ سزا بھول گیا ہوں

اے رہبرِ گمراہ مجھے راہ دکھا دے
نقشِ قدَمِ راہ نما بھول گیا ہوں

معلوم نہیں قافلہ کس سمت گیا ہے
کہ طرزِ کلام اس کی صدا بھول گیا ہوں

اک تماشا گلاب میں دیکھا
تجھ کو تیرے شباب میں دیکھا

ڈوب کر زندہ ہوگئی تھی پھر
سوہنی کو چناب میں دیکھا

بیچ دیوار کے انار کلی
ہوگئی دفن خواب میں دیکھا

ایک عالَم طلوع ہوتے ہوئے
رُخِ عالی جناب میں دیکھا

وقتِ اشراق یاد مجھ کو ہے
آفتاب آفتاب میں دیکھا

چہرہ تیرا حوالہ میرا ہے
یہی لکّھا کتاب میں دیکھا

تجھ کو پایا ہر ایک حالت میں
جاگتے اورخواب میں دیکھا

روٹھ کر مجھ سے جدا بیٹھا ہے
کر رہا عرش پر کیا بیٹھا ہے

اپنی مخلوق کے دل میں کب سے
صاحبِ ارض و سما بیٹھا ہے

مجھ کو پروا نہیں دشمن کی بھی
آسمانوں میں خدا بیٹھا ہے

مانتا ہی نہیں دل وہ ، مجھ کو
لوگ کہتے ہیں بُھلا بیٹھا ہے

نغمہ کوئل کا مِرے پہلو میں
پھر کوئی درد جگا بیٹھا ہے

صدق دل میں جو صفائی ہوگی
قبضہ میں تیرے خدائی ہوگی

بھیڑ سے دور بنا گھر اپنا
اس میں ہی تیری بھلائی ہوگی

ہم کو معلوم ہے اپنی قسمت
جان لیوا یہ جُدائی ہوگی

کیا یہ سچ ہے کہ قیامت کے روز
تیرے کوچے میں گدائی ہوگی

جانِ جاں! خُلد میں تیری خاطر
" کیا ہی رضواں سے لڑائی ہوگی"

طرزِ تکلم گُفتار بدلو
جیسے بھی ہو تُم کردار بدلو

اپنی روش پر دریا بہے گا
کشتی پرانی پتوار بدلو

کوئی سیاسی لیڈر نہیں ہوں
کیسے کہوں تُم سرکار بدلو

کچھ لوگ پہنچے ہیں منزلوں پر
چال اپنی بدلو رفتار بدلو

مشکل نہیں کوئی کام یارو!
اپنا طریق کار بدلو

دل مچلتا ہی رہا کیا فائدہ
میں چھلکتا ہی رہا کیا فائدہ

" میرا وقت آیا تو چلمن ڈالدی"
میں ترستا ہی رہا کیا فائدہ

ان کو منزل مل گئی دہلیز پر
میں بھٹکتا ہی رہا کیا فائدہ

مچھلیوں نے پر نکالے شوق سے
میں تڑپتا ہی رہا کیا فائدہ

وہ گرے، گر کے کھڑے بھی ہو گئے
میں سنبھلتا ہی رہا کیا فائدہ

یہ لوگ مگر کہتے ہیں میں ڈول رہا ہوں
ان کو نہیں معلوم انہیں تول رہا ہوں

اس دور کا منصور ہوں سولی پہ چڑھادو
سربستہ ہیں جو بھید وہی کھول رہا ہوں

اے مارنے والے کبھی تو نے ہے یہ سوچا
رگ رگ میں تِری آگہی میں گھول رہا ہوں

دریائے لطافت کی تہوں تک ہے رسائی
انمول گہر ہیں یہ جو میں رول رہا ہوں

میری نگہِ شوق حجابوں سے پرے ہے
جو دیکھتا ہوں میں وہی اب بول رہا ہوں

پانیوں کے بہاؤ جیسا تھا
یا ہوا کے دباؤ جیسا تھا

ہر کسی کو پسند آیا وہ
کہ مٹَر کے پلاؤ جیسا تھا

میں جوانی میں بھی ہوا زخمی
میرا بچپن بھی گھاؤ جیسا تھا

چہرہ اس کا جو غور سے دیکھا
برف رت میں الاؤ جیسا تھا

تیرتی گہرے پانیوں میں رہی
دل مرا بھی تو ناو جیسا تھا

وہ جو دریا کے دل میں بستا ہے
خود ہی وہ آب کو ترستا ہے

سانپ کو سانپ سے ہے خطرہ اور
نیولا نیولے کو ڈستا ہے

کون باہر نکل سکا ہے پھر
دل کے اندر ہزار رستہ ہے

کیکڑے ہوگئے بہت مہنگے
آدمی کیکڑے سے سستا ہے

بچّہ ہوں میں بھی کوئی نالائق
کس قدر بھاری بستہ ہے

دعا رائیگاں چشمِ تر جائے گی
کہاں تیرے دامن کو بھر جائے گی

یہ سیلاب عرصہ کے بعد آیا ہے
یہ موج ایک پل میں اُتر جائے گی

تِری بدگمانی کی دہلیز پر
ہماری یہ آواز مر جائے گی

تِرے آنے کے بعد پھر دیکھنا
اِدھر سے اُدھر تک خبر جائے گی

غنی غولِ دریا تو مرجائے گا
تھکن یہ بھنور کی کدھر جائے گی

خطہ دل ہرا نہیں ہوتا
کاش اتنا جلا نہیں ہوتا

کچھ بڑوں سے مجھے شکایت
اس لیئے میں بڑا نہیں ہوتا

ڈھائی فُٹ گہری قبر ہے اس کی
مُردہ بھی تو خفا نہیں ہوتا

مجھ سے اچھائی کی امید کرو
اچھا ہرگز بُرا نہیں ہوتا

گِر گیا بلندیوں سے میں
ورنہ جلدی مرا نہیں ہوتا

میں نے اس کو ڈرا ہی دنیا تھا
میں اگر خود ڈرا نہیں ہوتا

مجھ کو آخر میں ہی پہنچنا تھا
تم سے پہلے اگر چلا نہیں ہوتا

وہ بظاہر نہ ہوسکا شامل
دل سے لیکن جُدا نہیں ہوتا

آگ سے کھیلنا نہیں اچھّا
آگ کا کچھ پتہ نہیں ہوتا

کونسا بندہ خاص ہوں اُس کا
وہ بھی میرا خدا نہیں ہوتا

موم جیسے پگھل گئے رشتے
ہاتھ سے پھر نکل گئے رشتے

ڈگمگاتا ہی رہ گیا رہ میں
خیر سے پھر سنبھل گئے رشتے

چاندنی چوک* تھی تِری منزل
کیوں امیرا کدل* گئے رشتہ

اک ذرا آنچ کیا لگی انکو
ہوگئے ڈھیر جل گئے رشتے

زرد پڑتے ہی رنگ چہرے کا
ہجر کی شب بدل گئے رشتے

* دہلی

*سری نگر خاص میں جہلم پر تاریخی پُل

ہماری سماعت میں رس گھولتا ہے
اے مالک ترا نام کتنا بڑا ہے

نہ دو گالیاں دوسروں کے خدا کو
کتابوں میں لکّھا گیا ہے بجا ہے

گزرگاہ میں نقشِ پا فنا ہوگئے تم
فنا کی ہی جانب رواں قافلہ ہے

وہ پھوٹی ہے ظلمات کے ہی شکم سے
جہانوں میں پھیلی ہوئی جو ضیا ہے

سرِ خار قہر و غضب کی نشانی
گلوں کی زباں شرحِ مہر و وفا ہے

شکوہ کسی سے گلہ نہ کوئی
فرد فرید جچا نہ کوئی

فرض فریضہ کِیا نہ پُورا
ورد وظیفہ پڑھا نہ کوئی

فضل تمام ہُوا مجھ پر
قصّہ کہانی گڑھا نہ کوئی

شب کہ نویدِ سَحَر، عُقدہ
رنج بغیر کُھلا نہ کوئی

ایک لکیر ہے پتّھر کی
حکم حکیم ٹلا نہ کوئی

کوئی مجبوری ہے اُس کی بھی خدا تنہا کہیں
ہم بھی دریا وار بہتے ہیں سدا تنہا کہیں

منتشر ہم کو دکھائی دے رہے افراد ہیں
چل رہا تنہا ہے وہ بھی قافلہ تنہا کہیں

وہ مطابق ظرف کے ہے روشنی دیتا یہاں
کھولتا ہے آنکھ بھی اور اونگھتا تنہا کہیں

کنجِ تنہائی میں بیٹھا یار الجھے الجھے بال
حافظ و خیّام کا بھی میکدہ تنہا کہیں

دور سارے راستوں سے چھوڑ کر پگڈنڈیاں
شوق نے اپنا تراشا راستا تنہا کہیں

”بے نام کئی یار یہاں بھی ہیں وہاں بھی
کچھ تذکرے دَم دار یہاں بھی ہیں وہاں بھی

نیّر، غنی، کرّار یہاں بھی ہیں وہاں بھی
کچھ بانکے طرح دار یہاں بھی ہیں وہاں بھی

گل رنگ صلیبیں ہیں طرب خانے بیاباں!
مستی کے خریدار یہاں بھی ہیں وہاں بھی

ہیں جاہل و عالم بھی بہَم دست و گریباں
اک ساتھ گل و خار یہاں بھی ہیں وہاں بھی

ہے صورتِ حالات وہی شامِ غریباں
غم ناک عزا دار یہاں بھی ہیں وہاں بھی

روشن ہے ابھی سینوں میں اک شمعِ فروزاں
دل مشہدِ انوار یہاں بھی ہیں وہاں بھی

رہنے دے میرے مسیحا! پاس میرے رہنے دے
شہرِ ویراں دل خرابہ پاس میرے رہنے دے

کائناتِ حسن کی ہیں آیتیں ہر سمت اور
آدمی اس کا خلاصہ پاس میرے رہنے دے

دردِ دل جاگیر ہے میری عطا یزدان کی
شعر و نغمہ کُل اثاثہ پاس میرے رہنے دے

بہتی ہیں مرغابیاں رخسارِ آتش زار پر
میری آنکھوں کا دوآبہ پاس میرے رہنے دے

اشکوں سے لبریز ہیں آنکھیں غنی دھندلا جہاں
جسم و جاں روشن جزیرہ پاس میرے رہنے دے